ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

15 دسمبر 1968 کو بتقریب جشن زول قرآن ۔۔عیدالفطر۔۔
پرویز صاحب کا خصوصی درس قرآن کریم

آسمان سے رزق:

بنیادی طور پر لفظ عید کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنے والا واقعہ‘ لیکن اصطلاحاً اس سے مراد ہے وہ جشنِ مسرت جو بار بار آئے۔قرآن کریم میں یہ لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے‘اور وہ ہے وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰؑ کے جاں نثار حواریوں نے‘ آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لئے ’’مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ‘‘ اتارے تا کہ اس سے ہماری جسمانی پرورش کے علاوہ ہمارے قلوب کو بھی اطمینان حاصل ہو۔اس پر حضرت عیسیٰؑ نے خدا سے درخواست کی کہ: رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ (5:114)۔اے ہمارے پروردگار! ہماری نشوونما کا سامان ’’آسمان‘‘ سے عطا فرما تا کہ وہ رزق‘ اس جماعت کے السابقون الاولون کے لئے بھی موجبِ جشنِ مسرت ہو اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی۔۔تو بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔‘‘ سوال یہ ہے کہ یہ مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ آسمان سے اترنے والا رزق۔۔کیا تھا جس کی درخواست خدا سے کی گئی تھی اور جو ان سب کے لئے باعثِ جشنِ مسرت تھا۔اعجوبہ پسندوں نے توحسب معمول‘ اسے بھی ایک چیستان بنا دیا اور کہا کہ حواریوں کے لئے آسمان سے پکے پکائے کھانے کا طشت اترا کرتا تھا حتیٰ کہ اس میں جو کھانے اترتے تھے ان کی تفاصیل تک بھی دینے لگ گئے۔لیکن جن کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں‘ وہ جانتے ہیں کہ جماعت مومنین جب ’’آسمان سے رزق‘‘ طلب کرتی ہے تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔ایک رزق وہ ہے جو انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رو سے ملتا ہے۔ یہ وہ

رزق ہے جس سے جسم تو زندہ رہتا ہے لیکن شرفِ انسانیت کی موت واقع ہو جاتی ہے اور دوسرا رزق وہ ہے جس سے جسم انسانی کی نشوونما کے ساتھ' شرف وتکریم انسانیت کی بھی بالیدگی ہوتی ہے۔۔اقبال کے الفاظ میں ؎

ایں خدا نانے دہد جانے بُرد
آں خدا نانے دہد جانے دہد

(مفہوم: یہ خدا (لوگوں کو) روٹی دیتے ہیں اوراس کے بدلے میں جان نکال لیتے ہیں۔ جبکہ وہ حقیقی خدا (قرآن کی تعلیمات کے ذریعے) رزق، روٹی بھی دیتا ہے اور زندگی (کی خوشگواریاں بھی عطا کرتا ہے۔)

یہی وہ سماوی اقدار کے مطابق ملنے والا رزق تھا جس کے متعلق حواریوں نے کہا تھا کہ ان تاکل منہا و تطمئن قلوبنا۔وہ ہمارے لئے وجہ زیست بھی ہو اور باعثِ اطمینان قلب بھی۔مومن کے لئے باعثِ مسرت وہی رزق ہوسکتا ہے جس سے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو۔۔اور ظاہر ہے کہ مومن کو اطمینان قلب اسی زندگی میں حاصل ہوسکتا ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق بسر ہو۔۔۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ (13:28)۔یہی تھا وہ رزق جسے وَاٰيَةً مِّنْكَ (5:114)۔کہا گیا تھا۔یعنی خدا کے نظام ربوبیت کی صداقت کی نشانی اوراس کے خیر الرازقین ہونے کا ثبوت۔۔۔یہ رزق انہیں ملا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو۔فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ (5:115)۔جو اس نظام رزق سے انکار اور سرکشی کی روش اختیار کرے گا' جو اسے دوسروں سے چھپا کر رکھے گا' اس پر ایسا عذاب وارد ہوگا جس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

اس کفران کا نتیجہ:

یہی وہ عذاب ہے جسے سورۂ نحل میں ایک مثال کے ذریعے یوں سامنے لایا گیا ہے کہ:

خدا ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے۔اس کے رہنے والوں کو امن بھی حاصل تھا اور اطمینان بھی۔اس کی طرف چاروں طرف سے رزق فراوانیوں سے کھنچے چلا آتا تھا لیکن انہوں نے ان انعامات خداوندی سے کفر برتا اور نظام خداوندی کی جگہ اپنا خودساختہ نظام اختیار کرلیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔(16:112)۔

ایسینی فرقہ:

یہ انسانیت کی بڑی محرومی اور بدنصیبی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور انکے مقدس ساتھیوں کی اصلی تصویر یا تو ان کے نام لیواؤں کی عقیدت کی شمعوں کے دھوئیں سے ڈھپ چکی ہے اور یا اسے افسانہ طرازیوں کے پردوں میں چھپا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے آ ہی نہیں سکی کہ وہ کیسے عظیم انقلاب کے پیامبر تھے اور انہوں نے کس طرح یہودی پیشوائیت کے خود ساختہ نظام ہیکل اور رومیوں کے قصرِ حکومت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا تھا۔ اگر ان کی صحیح تاریخ سامنے آ جاتی تو معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے کس قسم کا آسمانی نظام معیشت قائم کیا تھا جس سے انہیں انسانوں کا مرہون منت ہوئے بغیر، سامان زیست میسر آتا اور ان کے لئے وجہ جشن عید بنتا تھا۔ لیکن وادئ قمران سے حال ہی میں جو دستاویزات برآمد ہوئی ہیں ان سے اس جماعت کے احوال وظروف پر خاصی روشنی پڑتی ہے جو اس زمانے میں ایسینی فرقہ کے نام سے معروف تھی اور جو حضرت یحییٰ کے زیر تربیت وقیادت پروان چڑھی تھی۔ خود حضرت عیسیٰؑ بھی، اپنے زمانۂ نبوت سے قبل اسی جماعت سے متعلق تھے۔ اس جماعت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں کوئی شے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ تمام سامانِ زیست مشترکہ استعمال کے لئے کھلا رکھا جاتا تھا۔ کسی کے پاس کوئی شے اس کی ضرورت سے فاضل نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد، آپ کے متبعین کی جو جماعت بیت المقدس میں آ کر جمع ہوئی تھی خود اس کے متعلق بھی، موجودہ انجیل میں لکھا ہے کہ:

وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (سب مل کر) خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے اور خدا کی حمد کرتے اور سب لوگوں کو عزیز رکھتے تھے۔

(رسولوں کے اعمال۔ 27-2:21)

یہ تھا وہ نظامِ رزق جسے انہوں نے مائدۃ من السماء (سماوی اقدار کے مطابق رزق) کہہ کر پکارا تھا اور جس کے ملنے پر جشن عید منایا گیا تھا۔

رسولؐ اللہ کی دعوت کی مخالفت:

اور یہ صرف حضرت عیسیٰ، اور ان کے حواریوں کی خصوصیت نہیں تھی۔ خدا کا ہر رسول اسی

قسم کا انقلابی نظام قائم کرنے کے لئے آتا تھا جس میں ''تیری اور میری'' کا جھگڑا نہ رہے اور جو کچھ جماعت (یا امت) کے پاس ہو وہ سب کے لئے مشترکہ متاعِ زیست ہو۔ کیا آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی اس روایت پر غور نہیں کیا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ قبیلہ اشعر کے ہاں یہ دستور تھا کہ جنگ کے زمانے میں، یا ویسے ہی جب ضرورت کا تقاضا ہوتا، قبیلے کے تمام افراد سارا سامان رزق ایک جگہ جمع کر لیتے اور اس میں سے ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لیتا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس اعتبار سے میں بھی قبیلہ اشعر میں سے ہوں۔ یہی تھا وہ آسمانی انقلاب جسے برپا کرنے کے لئے حضور ﷺ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تھا۔ قریش کے تاجروں، مہاجنوں اور کعبہ کے مجاوروں کی طرف سے جو اس دعوت کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی تھی تو اس لئے نہیں کہ اس میں ایک خدا کو الٰہ تسلیم کرنے کی تعلیم تھی۔ اس سے ان کا کیا بگڑتا تھا؟ یہ مخالفت اس لئے تھی کہ اس میں وحدت خالق کے ایمان کا فطری نتیجہ وحدت انسانیت کا نظریہ تھا۔ اس سے مساوات انسانیہ کا اصول سامنے آتا تھا جس کی رو سے، مختلف افراد میں کسی قسم کی تفریق باقی نہیں رہتی تھی۔ ''اللہ ایک ہے'' کے عقیدہ سے انہیں کسی قسم کی پرخاش نہیں تھی۔ انہیں مخاصمت تھی اس نظریہ سے کہ تمام انسان ایک جیسے ہیں اور ''تمام انسان ایک جیسے ہیں'' کے نظریہ کا اولین عملی نتیجہ یہ تھا کہ سامان زیست میں تمام افراد یکساں طور پر شریک ہیں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کے سرچشموں پر اس طرح سانپ بن کر بیٹھ جائے کہ دوسرے انسان اپنی روٹی تک کے لئے اس کے دست نگر اور محتاج ہو جائیں۔ ابوجہل نے غلاف کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں سے جو فریاد کی تھی وہ یہی تھی کہ اس نئے دین لانے والے کی قیامت خیزیوں کو دیکھو کہ۔

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بریک خواں نشست
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلماں رضی اللہ عنہ مزدکی است

(مفہوم: اس کی نگاہ میں بالا اور پست، اونچا اور نیچ برابر ہیں۔ وہ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دسترخواں پر، مل کر کھانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے۔ (عربی اصولوں کے خلاف ہیں) میں خوب جانتا ہوں کہ یہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ''مزدکی'' ہے)

مساواتِ انسانیہ کا اصول:

یہ تھا وہ نظام، جسے ہر رسول پیش کرتا تھا اور جس کی مخالفت اس کی قوم کے متمول طبقے کی طرف سے ہوتی تھی۔قوم مدین نے حضرت شعیبؑ کی نماز (صلوٰۃ) کے خلاف اعتراض نہیں کیا تھا۔ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ صلوٰۃ، انہیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرسکیں۔آپ نے غور فرمایا کہ نظام خداوندی میں صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہوتا ہے؟ یہ نظام، دولت پر اپنا کنٹرول اس لئے رکھتا ہے کہ اس سے مساوات انسانیہ قائم رہتی ہے۔مساوات کے سلسلہ میں آپ غور کیجئے کہ محل میں پیدا ہونے والا اور جھونپڑی میں جنم لینے والا، دونوں، ایک جیسی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔محل میں پیدا ہونے والا بچہ نہ اپنی پیٹھ پر سونے اور چاندی کی تھیلیاں لاد کر لاتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں کوئی خداوندی دستاویز ہوتی ہے کہ ہم نے اسے اتنے مربعے اراضی یا اتنے کارخانوں کا مالک بنادیا ہے۔دونوں بچے خالی ہاتھ پیدا ہوتے ہیں۔پھر دونوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی یکساں ہوتی ہیں۔یعنی جن اشیاء پر ان کی زندگی کا مدار ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔یہ ہے مساوات انسانیہ کی بنیاد۔لیکن انسانوں کا خود ساختہ غلط نظام، ان میں تفریق پیدا کردیتا ہے۔۔ایسی تفریق کہ ایک انسان کے بچوں کو اتنا بھی میسر نہیں جتنا دوسرے انسان کے کتوں کو ملتا ہے۔دین خداوندی اس تفریق کو مٹا کر، مساوات انسانیہ قائم کرنے کے لئے آتا ہے اور خدا کا رسول اس نظام کو عملاً متشکل کر کے دکھاتا ہے۔

روٹی کی اہمیت:

اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا مدار صرف ''روٹی'' (بنیادی ضروریات زندگی) پر نہیں۔لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ارتقائے حیات کی موجودہ سطح پر، انسان کی طبیعی زندگی کا مدار روٹی ہی پر ہے۔یہی وجہ ہے کہ نظام خداوندی میں روٹی کو اس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جب دنیا میں خدا کے پہلے گھر کی بنیاد رکھتے ہیں۔۔۔یعنی توحید کا اولین مرکز قائم کرتے ہیں۔۔۔تو اس کے بعد سب سے پہلی آرزو جو دعا بن کر ان کے لبوں تک آتی ہے، یہی ہے کہ: رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (2:126)۔اے میرے نشوونما دینے والے! تو اس بستی کو پر امن بنادے اور اس کے رہنے والوں کو ہر طرح کا رزق مہیا کردے۔قرآن کریم کے متعدد مقامات میں، رزق فراواں کو خدا کا انعام، اور بھوک کا

اس کا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ اس نے بنی آدم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا ۔ (20:124) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى (20:124) اور جس کی یہاں روزی تنگ ہو گی اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ (7:40)۔ ان پر آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ یہی تھا خدائے جلیل کا وہ اعلان عظیم جس کی تشریح میں نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ''جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی اس طرح صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' خدا نے اس بستی سے اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا۔'' یہ کیا ہے؟ وہ عدم مساوات انسانیہ جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اگر اس بستی پر کوئی آفت آ گئی تھی (اور ایسا بعض اوقات ہنگامی حالات میں ہو جاتا ہے) تو اس کے تمام باشندوں کو بھوکا رہنا چاہئے تھا لیکن ایسا نظام جس میں بستی کے چند افراد تو پیٹ بھر کر کھا لیں لیکن دیگر افراد بھوکے رات کاٹیں' یہ اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے اس بستی پر سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔ خدا تو اس نظام کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے جو اس کے قوانین کے مطابق متشکل ہو۔ وہ نظریہ زندگی' وہ نظام حیات' وہ تہذیب' وہ تمدن کبھی باقی نہیں رہ سکتا جس میں انسان اور انسان میں فرق کیا جائے' جس میں طبقاتی تقسیم ہو۔ فلاح اور بقا اسی نظریہ' اسی نظام' اسی تمدن کے لئے ہے جو بلا تفریق تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں باعث منفعت ہو۔ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ (13:17)۔ حقیقت یہ ہے کہ بھوکے آدمی کے لئے تمدنی ترقی کا کوئی شعبہ بھی وجہ کشش اور باعث طمانیت و تسکین نہیں ہو سکتا۔۔ کسی بھوکے آدمی کو جناح باغ لے جا کر بہار کی رنگینیاں اور کیف آفرینیاں دکھایئے' وہ انہیں کبھی (Appreciate) نہیں کر سکے گا۔ اسے بتایئے کہ ملک میں بجلی اس قدر عام ہو گئی ہے کہ گھر گھر قمقمے جل رہے ہیں۔ سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔ سر بفلک عمارات کھڑی ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے گرانڈیل کارخانے مصروفِ گردش ہیں۔ فضا میں طیارے پر فشاں ہیں۔ زمین پر موٹریں سبک خرام ہیں۔ وہ یہ سن کر کہے گا کہ یہ سب ٹھیک ہے لیکن ۔۔ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی ۔۔ بھوک میں بہار کی نزہت آفرینیوں اور بجلی کے قمقموں کی نور افشانیوں سے لطف اندوز ہونا تو ایک طرف' سعدی کے الفاظ میں' بھوکے کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ رات کو نماز

کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس سوچ میں غرق ہوتا ہے کہ۔۔ چہ خورد بامداد فرزندم۔۔صبح میرے بچوں کو روٹی کہاں سے ملے گی۔۔اس سے بھی آگے بڑھیئے جاہلیہ عرب میں قبیلہ بنو حنفیہ نے آٹے کا ایک بت بنا رکھا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔لیکن جب قحط پڑا تو وہ اپنے اس خدا کو بھی کھا گئے۔اور ایک قبیلہ بنو حنفیہ ہی پر کیا منحصر ہے' ہر بھوکا اس خدا کو کھا جاتا ہے جو اسے روٹی نہیں دیتا۔روس کے انقلابیوں نے اسی طرح اس خدا کو کھا لیا تھا جس کے متعلق انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی مفلسی اور مفلوک الحالی کا ذمہ دار وہی ہے۔۔لہٰذا جس شخص کے پیٹ میں روٹی نہیں' جس کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں' جسے سر چھپانے کے لئے چھت میسر نہیں' جس کے پاس دم توڑنے والے بچے کے حلق میں ٹپکانے کے لئے دودھ کے چار قطرے نہیں' اس کے لئے دنیا کی کوئی جاذبیت وجہ ٔسکون اور باعث دلکشی نہیں ہوسکتی۔جس شخص کے پاس اپنے بچے کے داخلہ کے لئے پیسے نہیں' اس کے لئے یہ خوش خبری کس طرح وجہ ٔطمانیت ہوسکتی ہے کہ ملک میں دس ہزار اسکول کھل گئے ہیں اور دو ہزار کالج قائم ہو گئے ہیں۔۔قوم کی ترقی کا معیار ایک اور فقط ایک ہے۔اور وہ یہ کہ اسمیں ہر ایک فرد کو کیا میسر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں چند انسانوں کو کیا کچھ حاصل ہو گیا ہے اور حاصل ہو رہا ہے۔۔جنت کی تو بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں جس قدر سامان آسائش و آرائش ہے' ہر ایک کے لئے یکساں ہے۔جس جنت میں مساوات انسانیہ نہیں' وہ جنت نہیں جہنم ہے۔

صرف خدا کی ملکیت:

لیکن اس قسم کی عملی مساوات انسانیہ تو اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے جب رزق کے سرچشمے خدا کی ملکیت میں رہیں' افراد کی ملکیت میں نہ چلے جائیں۔ جنت کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس کی زمین' اس کے چشمے' اس کی نہریں' اس کے باغات' افراد کی ملکیت ہوں گے کہ جس کا جی چاہے اپنے قطعہ ٔاراضی کو پٹہ پر دیدے اور جس کا جی چاہے' اسے گرو رکھ دے یا فروخت کر دے۔توحید کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ سارے سلسلہ ٔکائنات کا واحد مالک خدا ہے۔ اگر اس کی ملکیت میں کسی اور کو شامل کر لیا جائے تو یہ شرک ہے۔ایسے لوگوں کو قرآن انداداً من دون اللہ کہہ کر پکارتا ہے (2:22)۔جب رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت تسلیم کر لی جائے تو جن لوگوں کی اپنی ملکیت نہ ہو' وہ ان مالکوں کے محتاج اور دست نگر ہو جاتے ہیں اور محتاجی کا اگلا قدم۔۔ یا یوں کہئے کہ فطری نتیجہ۔۔محکومی ہے۔قرآن' اس تصور کی جڑ کاٹ کر رکھ

دیتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو جب وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا ۔ تم خدا کو چھوڑ کر جن کی محکومی اختیار کرتے ہو' جن کے تابع فرمان رہتے ہو' وہ وسائل رزق کے مالک نہیں۔ اس لئے تم فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ ۔۔ رزق' خدا کے ہاں سے طلب کو۔ وَاعْبُدُوْهُ ۔ اس طرح محکومی صرف اسی کی باقی رہ جائے گی۔ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ (29:17)۔ اور سپاس گزاری بھی اسی کی زیبا ہو گی۔ تم اپنے غلط نظام معیشت کی وجہ سے' دوسرے انسانوں کو ذرائع رزق کا مالک بنا دیتے ہو۔ پھر تم ان کے محتاج و محکوم بھی ہو جاتے ہو اور رہین منت اور سپاس گزار بھی۔ اس طرح تم اپنی شرف انسانیت کو بیچ کر' اپنے بدن کو زندہ رکھتے ہو۔ قرآن' اس طرح سے حاصل کردہ رزق کو حلال وطیب قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ: فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ (16:114)۔ اگر تم انسانوں کی محکومی کے چنگل سے آزاد ہو کر صرف خدا کی محکومی اختیار کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم رزق صرف خدا کے ہاں سے حاصل کرو اور اس طرح شکر گزار بھی اسی کے بنو۔ یہی وہ رزق ہے جسے حلال وطیب کہا جائے گا۔ یعنی مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۔ وہ رزق جو تمہیں خدا کے ہاں سے ملے جس میں کسی انسان کی ملکیت کا دخل نہ ہو۔ یہی تھا وہ حلال وطیب رزق جس کے لئے حضرت عیسیٰ ؑ کے حواریوں نے درخواست کی تھی اور جس کے حصول کے بعد جشن عید منایا گیا تھا اور یہی تھا وہ رزق طیب جو اس رسول ؐ آخر الزمان کے متشکل کردہ نظام کی وساطت سے حاصل ہوا تھا جس کی بعثت عظمیٰ کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ (7:157) وہ نوع انسان کے لئے رزق طیب کو حلال قرار دے گا اور رزق خبیث کو حرام ٹھہرائے گا اور اس طرح ان اغلال و سلاسل کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑے چلی آ رہی تھی اور محتاجی و محکومی کی استخواں شکن سلوں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ جو رزق نظام خداوندی کے تابع ملتا ہے' اسے قرآن نے ہر جگہ ''رزق کریم'' کہہ کر کیوں تعبیر کیا ہے؟ اس لئے کہ رزق تو انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رو سے بھی مل ہی جاتا ہے' لیکن وہ رزق ملتا ہے عزت اور توقیر بیچ کر۔ لیکن خدا کی طرف سے جو رزق ملتا ہے اس میں تکریم و احترام انسانیت بھی باقی رہتی ہے۔ اسی لئے یہ رزق ''رزق کریم'' ہوتا ہے۔

انسانیت کش نظام:

دین خداوندی کا مقصد ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پا کر پروان چڑھ جائیں اور اس طرح وہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہ صلاحیتیں اسی صورت میں برومند ہوسکتی ہیں جب وہ سامان زیست کے لئے کسی انسان کا دست نگر نہ ہو۔ رزق کو اپنے ہاتھ میں لے لینے والی قوتیں اتنا ہی نہیں کرتیں کہ وہ لوگوں کو مفلس اور محتاج بنا دیتی ہیں۔ وہ ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتیں۔ اس لئے کہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے تابع فرمان کام کرنے والوں کی صلاحیتیں نشوونما پا گئیں تو وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائیں گے اور انہیں حیوانات کی طرح دبا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا' ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف حیوانی سطح پر زندہ رہیں' انسانی سطح پر کبھی نہ آ سکیں۔ آپ سوچئے کہ جب انسانوں کی اکثریت کو اس طرح ابھرنے اور آگے بڑھنے سے روک دیا جائے تو یہ چیز ارتقائے انسانیت کے راستے میں کس قدر سنگ گراں بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اکتناز دولت کرنے والے سرمایہ داروں اور ان کے شریک کار مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا ہے کہ وہ کاروان انسانیت کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہیں خدا کی طرف جانے ہی نہیں دیتے۔ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ ؕ (9:34)۔

رسول کے بعد:

قرآن بتاتا ہے (اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ) خدا کا رسول اس قسم کا انقلابی نظام متشکل کر کے چلا جاتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد' مفاد پرست گروہ پھر سے سر نکالتا اور اس نظام کو الٹنے کی کوشش کرتا لیکن وہ تنہا ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملاتا۔ یہ مذہبی پیشوا اس سلسلہ میں کیا ٹیکنیک اختیار کرتے' اسے قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کے معاشرہ کی حالت یہ ہوچکی تھی کہ انکے ہاں کے بڑے بڑے لوگ (جو دولت اور قوت کے مالک بن بیٹھے تھے) کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے اور جب انہیں دشمن پکڑ کر لے جاتا تو پھر چندہ اکٹھا کرتے تاکہ ان کا فدیہ دے کر انہیں دشمن کی قید سے آزاد کرا لیا جائے۔ وہ (انہیں اس طرح آزاد کرانے کو) بڑا ثواب کا کام سمجھتے۔ اگر مذہب پرستی کی سطحی نگاہ سے دیکھا

جائے تو یہ کام واقعی بڑے ثواب کا نظر آئے گا۔۔۔ خود قرآن کریم میں' اسیروں اور غلاموں کو آزاد کرانے کے کام کو بڑا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔۔ لیکن قرآن اس قسم کے نظر فریب سطحی جذبات سے بلند ہو کر حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اس نے اس مقام پر کہا کہ اس طرح قیدیوں کا فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو ثواب کا کام سمجھنے والو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ: وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ط ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرنا' ایسا سنگین جرم تھا جس کی تلافی اس قسم کے خیرات کے کاموں سے نہیں ہو سکتی۔ تمہیں جو ضابطۂ ہدایت دیا گیا تھا اس میں دو احکام تھے۔۔ ایک یہ کہ اپنے ہاں کبھی ایسی صورت پیدا نہ کرو کہ تم میں سے کمزور لوگوں کو دشمن اچک کر لے جائیں اور دوسرے یہ کہ جن کمزور و ناتواں لوگوں کو مستبد قوتیں قیدی بنا لیں انہیں فدیہ دے کر چھڑا دیا کرو۔ یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ تم نے پہلے حکم کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا بلکہ عمداً اس کی خلاف ورزی کی اور دوسرے حکم کی تعمیل سے اپنے آپ کو بڑا نیکوکار سمجھنے لگ گئے۔ یہ روش غلط ہے۔ ضابطہ خداوندی کو بتمامہٖ لیا جائے گا تو اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب ہو گا۔ لیکن اگر ایسا کیا جائے کہ: أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ج اس کے ایک حصہ پر ایمان رکھا جائے اور دوسرے حصہ سے انکار کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں برآمد ہو گا کہ تمہیں پچاس فیصد نمبر مل جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ط (2:85) تم دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل وخوار ہو گے اور قیامت کے دن بھی سخت ترین عذاب میں گرفتار۔

مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ نظام خداوندی کے اس حصہ کو جس سے مفاد پرستوں کی منفعت کوشیوں پر زد پڑتی ہو' پس پشت ڈال دیتی ہے اور ظواہر و رسوم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہے کہ وہ عین دین بن جاتی ہیں۔ یہ ہے ان کی وہ ٹیکنیک جس سے وہ قوم کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ دین خداوندی پر عامل ہے۔

جس طرح سابقہ امتوں کے احبار و رہبان نے یہ چال چلی تھی' اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کے ہاں بھی دین کی اصل و اساس کو پس پشت ڈال دیا گیا اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بڑھا بڑھا کر عین دین بنا دیا گیا۔ اب سارا زور ان جزئیات کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ دین کی اصل و بنیاد کو سامنے نہ آنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کچھ

روایات اور حکایات وضع کی جاتی ہیں جنہیں کبھی حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور کبھی سلف صالحین کی طرف۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

(1) قرآن کریم میں ہے:

دولت جمع کرنے کے خلاف:

اے ایمان والو! یاد رکھو۔ ان علماء و مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو لوگوں کے مال کو ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور اس طرح انہیں خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

(اور اسے بھی یاد رکھو کہ) جو لوگ دولت جمع کرتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی منفعت کے لئے (فی سبیل اللہ) کھلا نہیں رکھتے' ان کے لئے الم انگیز عذاب ہے۔ جس دن چاندی سونے کے ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں' ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ اب اس اکتناز کا مزہ چکھو۔(9:34-35)

ان آیات سے روز روشن کی طرح واضح ہے (اور قرآن میں اس مضمون کی یہی دو آیات نہیں۔ اس قسم کی متعدد آیات ہیں) کہ اسلام ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں دولت جمع نہیں کی جا سکتی۔ اب دیکھئے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے خلاف کیا کیا۔ اس نے ایک روایت وضع کی جو غور سے سننے کے قابل ہے۔ وہ روایت یہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب (مندرجہ بالا) آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گذری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ الخ

(ابوداؤد، بحوالہ مشکوٰۃ، جلد اوّل، اردو ترجمہ ص:309)

آپ غور فرمایئے کہ اس ایک روایت نے کس طرح اسلام کے پورے کے پورے معاشی

نظام کو الٹ کر رکھ دیا۔ اس روایت سے (جو ظاہر ہے کہ وضعی ہے) یہ ثابت ہوا کہ۔
(1) صحابہؓ سب کے سب سرمایہ دار تھے اور دولت جمع کرنا ان کا شعار تھا۔
(2) صحابہؓ کی (معاذ اللہ) کیفیت یہ تھی کہ خدا ایک حکم نازل کرتا ہے۔ اس کا رسول اس حکم کو ان تک پہنچاتا ہے۔ لیکن وہ حکم ان پر سخت گراں گزرتا ہے۔ وہ اسے بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے (معاذ اللہ) ان سرمایہ پرستوں کا سب سے بڑا نمائندہ حضرت عمرؓ رسولؐ اللہ کے پاس جاتا ہے۔
(3) رسولؐ اللہ (معاذ اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ تم خدا کے اس حکم کا کچھ خیال نہ کرو۔ تم جتنی جی چاہے دولت جمع کرتے جاؤ۔ بس اس میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ نکال دیا کرو۔ باقی دولت سب پاک ہو جائے گی۔ (واضح رہے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا حکم بھی قرآن میں کہیں نہیں)۔
آپ دیکھیں گے کہ اس اڑھائی فیصد زکوٰۃ کی اہمیت اور افضلیت پر اس قدر زور دیا جائے گا اور قرآن کی اس آیت کے متعلق (جس میں دولت جمع کرنے کے خلاف اس قدر تہدید آئی ہے) ایک لفظ بھی نہیں کہا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ٹیکنیک سے مسلمانوں کو کس طرح اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ دولت جمع کرنا کوئی جرم نہیں اور زکوٰۃ دیدینے سے سب مال پاک ہو جاتا ہے!

عبوری دور کے احکام:

ایک مثال اور لیجئے۔ قرآن کریم کا نصب العین ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل تھا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ ہر فرد کو اس کی ضروریات زندگی' بطور بنیادی حق انسانیت ملتی رہیں۔ آغاز اسلام کے وقت معاشرہ جس حالت میں تھا اس نے' اپنے پروگرام کو وہاں سے شروع کر کے' بتدریج اس کے منتہیٰ تک لے جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت معاشرہ میں طبقاتی تفاوت موجود تھا۔۔ کچھ لوگ امیر تھے' کچھ غریب اور محتاج۔۔ اس عبوری دور کے لئے قرآن نے دولت مندوں کو تلقین و تاکید کی کہ وہ صدقہ و خیرات سے محتاجوں کی مدد کریں۔ وراثت کے احکام بھی بنیادی طور پر اسی دور سے متعلق تھے۔ اس نظام کی آخری شکل یہ تھی جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (2:219)۔ اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری

اپنی بنیادی ضروریات سے زائد ہے' سب کا سب۔ یہ نظام ایسا تھا جس میں ہر ایک کی ضروریات نظام مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں اور کسی کے پاس فالتو روپیہ رہتا ہی نہیں تھا۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے صدقہ' خیرات' فطرانہ کے لئے صبح و شام' دن رات' ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور قرآن کی وہ آیت جس میں حکم دیا گیا تھا کہ فالتو دولت کسی فرد کے پاس نہ رہنے پائے' کبھی سامنے نہیں لائی جاتی! جب اس پر زور دیجئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ آیت' زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہو چکی ہے۔ (بحوالہ روایت حضرت ابن عباسؓ)

صدقہ و خیرات کا نتیجہ:

اور آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ صدقہ اور خیرات کا عملی مفہوم کیا ہے؟ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نظام معاشرہ ایسا قائم کیا جائے جس میں ایک طبقہ ہمیشہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم' فلہٰذا' دوسروں کا محتاج رہے اور دوسرا طبقہ ایسا ہو جس کے پاس اپنی ضروریات سے زائد دولت ہو۔ یہ دوسرا طبقہ' پہلے طبقہ کو خیرات دے کر ثواب کمائے۔ آپ سوچئے کہ اس دوسرے طبقہ کے پاس یہ فالتو روپیہ آیا کہاں سے ہے؟ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ یہ روپیہ انہی لوگوں کی محنت کی کمائی ہے' جو معاشرہ میں محتاج بن چکے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو ان کی محنت کا پورا پورا ماحصل دے دیا جاتا تو نہ وہ محتاج ہوتے' نہ ان کے پاس فالتو روپیہ آتا۔ لیکن اس نظام نے کیا یہ کہ پہلے ایک طبقہ نے محنت کشوں کی کمائی کو غصب کیا اور اس طرح خود دولت مند بن گیا اور محنت کشوں کو محتاج بنا دیا۔ اور پھر ان محتاجوں کو خیرات کے چند ٹکے دے کر' جنت کا مالک بن بیٹھا۔ حالانکہ' قرآن کے الفاظ میں' ان لوگوں کو محتاج بنانا ایسا سنگین جرم ہے جس کی تلافی صدقہ' اور خیرات سے ہو ہی نہیں سکتی۔ خیرات دینے والے کا نفس موٹا ہو جاتا ہے اور لینے والے کے شرفِ انسانیت کی سخت تذلیل ہوتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق۔

الصدقۃ تمیت القلب

خیرات سے انسان کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم نے عبوری دور کے لئے (اسلامی نظام کی تشکیل کے زمانے تک بہ تقاضائے حالات) اسے روا رکھا تھا۔ اور اس میں بھی دینے والوں سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس جذبہ کے

ماتحت دیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9)۔ ہم تم سے کسی معاوضہ کے متمنی ہیں نہ شکریہ کے خواہاں۔ اور اس کی تاکید کر دی تھی کہ وہ محتاج کی امداد کے بعد اسے احسان جتا کر اپنے صدقات کو باطل نہ بنا دیں لیکن موجودہ مذہب نے صدقہ وخیرات کو مستقل کارِ ثواب قرار دے کر، قوم میں محتاجوں اور مفلسوں کے گروہ کی موجودگی کو مستقلاً ضروری قرار دے دیا تاکہ ثواب دارین حاصل کیا جائے۔ کیا یہ وہی بنی اسرائیل کی روش نہیں جس سے وہ پہلے اپنے ہم نفسوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے اور پھر فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو بہت بڑی نیکی کا کام تصور کرتے تھے؟ یاد رکھئے! جس نظام معاشرہ میں محتاج اور مفلس مستقلاً موجود رہیں اس سے زیادہ انسانیت سوز نظام کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

نظامِ ربوٰ:

ایک مثال اور سامنے لائیے۔ قرآنی تصورِ معیشت کی رو سے، کوئی شخص جو کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کو کلیتہً یا جزءً ہتیا کر لے جائے، وہ چور ہے، ڈاکو ہے، رہزن ہے، فریب کار ہے۔ قرآن ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کوئی کسی کی محنت کو غصب کر کے نہیں لے جا سکتا۔ اس کی بالکل ضد ایک اور نظامِ معیشت ہے جس میں ایک شخص محض سرمایہ کے زور پر دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا ہے۔ وہ اسے ربوٰ کے نظام سے تعبیر کرتا ہے۔۔ ربوٰ کے معنی ہیں بڑھوتری۔ یعنی اپنے سرمایہ سے زیادہ وصول کرنا۔ یہ نظام اس قدر قرآنی نظام کی ضد اور اس کا دشمن ہے کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (2:279)۔ انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا الٹی میٹم دے دو۔ آپ نے غور کیا کہ اسلامی نظام کی رو سے ربوٰ کیسا سنگین ترین جرم ہے۔ یہ بغاوت کے مرادف ہے۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے کیا کیا۔ وہ ربوٰ کو جائز تو قرار نہیں دے سکتی تھی لیکن اس نے ربوٰ کی تعریف (Definition) ایسی کر دی جس میں دوسروں کی محنت کا غصب کر کے لے جانا شیرِ مادر کی طرح حلال وطیب قرار پا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایک شخص کسی کو کچھ روپیہ قرض دے تو اس اصل زر سے کچھ زیادہ وصول کرنا ربوٰ ہے اور بس۔ یعنی زمیندار کا، کاشتکار کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیدا کردہ فصل کا آدھا سمیٹ لینا ربوٰ نہیں۔ صاحب جائداد کا مکانوں کا کرایہ وصول کرنا ربوٰ نہیں۔ ایک کارخانہ دار کا ہزار ہا مزدوروں کی محنت کے ماحصل میں سے انہیں تین چار روپیہ روزانہ دے کر باقی سارا غصب کر لینا ربوٰ نہیں۔ دکاندار کا، کاریگر کو کم از کم

اجرت دے کر، باقی سارا منافع ہڑپ کر جانا، ربوٰ نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ مذہبی پیشوائیت نے ربوٰ کی غلط (Definition) سے، (ایک مختصر سی شکل کو چھوڑ کر) ربوٰ کے سارے کاروبار کو کس طرح حلال وطیب قرار دے دیا۔

تجارت کا منافع:

اسی سلسلہ میں، ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ قرآن کریم نے لاگت پر کچھ زیادہ وصول کر لینے کو تجارت قرار دے کر، اس منافع کو جائز قرار دیا تھا۔ یہ درحقیقت، اس چیز کے فروخت کرنے والے کی محنت کا معاوضہ تھا۔ قدیم زمانہ میں تجارت جان جوکھوں کا کام ہوتا تھا۔ جو قافلہ ترکستان سے سامان لاد کر، پہاڑوں، دریاؤں، صحراؤں، جنگلوں، پرخطر راستوں، برفانی چوٹیوں کو عبور کرتا ہوا، مہینوں کے بعد ہندوستان پہنچتا تھا، وہ جو کچھ اپنے مال پر زائد وصول کرتا تھا، وہ اس کی محنت کا معاوضہ تھا۔ اسے قرآن نے ربوٰ کی حد سے خارج قرار دیا تھا۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ ایک شخص، ایک کمرہ میں میز کے سامنے بیٹھا ٹیلیفون پر سودے پر سودے کرتا چلا جاتا ہے۔ نہ حقیقتاً کچھ خریدتا ہے نہ بیچتا اور اس طرح شام کو ہزاروں روپے اس کے بینک میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسے تجارت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہزاروں روپے کہاں سے آتے ہیں؟ ان اشیاء کے صارفین کی جیب سے۔ کیا یہ صارفین کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو غصب کر لینے کے مرادف، فلہٰذا ربوٰ نہیں؟ لیکن مذہبی پیشوائیت کا نظام اسے ربوٰ قرار نہیں دیتا۔۔ وہ، دوسروں کی محنت غصب کر لینے کے ان تمام طریقوں کو حلال وطیب قرار دیتا ہے اور اس سے جب محنت کش یا صارفین غریب ہو جاتے ہیں، تو ان زمینداروں، کارخانہ داروں، اور اس قسم کے منافع خور سوداگروں سے اپیل کرتا ہے کہ ان غریبوں کو خدا واسطے کچھ دے کر، اپنا گھر جنت میں الاٹ کرا لیں یا حج کر کے اپنے سب گناہ بخشوا لیں۔ حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ؕ (2:85) ان محنت کشوں کی محنت کو غصب کر کے اپنی تجوریاں بھرتے چلے جانا ایسا سنگین جرم تھا جسے خدا اور رسولؐ کے خلاف بغاوت قرار دیا گیا تھا۔۔ غلط نظام کی عدالت، چور، ڈاکو، رہزن کو مجرم قرار دے کر مستوجب سزا ٹھہرائے گی لیکن اس قسم کے رہزنوں، اور قزاقوں کو کسی جرم کا مرتکب قرار نہیں دے گی۔ علمائے کرام، روپیہ کا سودی کاروبار کرنے والے کو جہنم کا کندہ بنائیں گے، لیکن ربوٰ کی ان دوسری شکلوں میں، سر سے پاؤں تک ڈوبے رہنے والوں کو پکے اور سچے مومن قرار دیں گے۔۔ ہے ناں یہ

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (2:85) کی بین مثال!

بھوکے کا جرم:

اس کے برعکس، اگر کسی مزدور کو مسلسل کوشش کے باوجود روزگار نہ ملے اور بھوک سے تنگ آ کر کہیں سے روٹی چرا لے تو قانون اسے جیل خانے بھیج دیتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ بھی ہماری تاریخ میں موجود ہے کہ جب ایک شخص کے ملازموں (غلاموں) نے بھوک سے تنگ آ کر غلہ چرایا تھا، تو حضرت عمرؓ نے انہیں سزا نہیں دی تھی۔ سزا ان کے مالک کو دی تھی، یہ کہہ کر کہ اگر تم انہیں بھوکا نہ رکھتے تو یہ چوری کرنے پر مجبور کیوں ہوتے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ درحقیقت قرآن کریم کے اس نظریہ پر مبنی ہے کہ اضطراری حالت میں بقدر ضرورت حرام شے کا کھا لینا بھی جائز ہے۔ امام ابن حزم نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

فقہا کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص پیاسا ہے اور اس کی وجہ سے اسے موت کا خطرہ لاحق ہو رہا ہے تو اس کے لئے فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی پانی پائے، لے لے۔ خواہ اس کے لئے اسے جنگ تک بھی کیوں نہ کرنی پڑے۔

اس پر اضافہ کرتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں کہ:

اگر پیاس کی وجہ سے موت کی مدافعت کے لئے پانی حاصل کرنے کی خاطر جنگ کرنے کی اجازت ہے تو کیا وجہ ہے کہ بھوک اور عریانی کی وجہ سے حفاظت جان کے لئے جنگ کرنے کی اجازت نہ ہو۔ ان دونوں میں فرق کرنا قرآن، سنت، اجماع اور فقہی قانون قیاس کے خلاف ہے۔

اس کے بعد امام ابن حزم کہتے ہیں کہ:

اگر اس مقابلہ میں یہ مجبور شخص مارا جائے تو فریق مخالف کے ذمے اس کی دیت لازم آ جائے گی۔ لیکن اگر وہ شخص مارا جائے جو اس کے حق کو روک رہا تھا تو اس پر خدا کی لعنت ہو گی۔ کیونکہ اس نے اس کا حق روکا تھا۔ (المحلیٰ، جلد:6)

معاشرہ میں اس قسم کی صورت حالات کے پیدا ہونے کو روکنے کے لئے حضور نبی اکرمؐ نے وہ نسخہ تجویز فرمایا تھا جسے آپ نے تمثیلی انداز میں یوں بیان فرمایا تھا کہ

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ

کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کر روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔۔باب الفتن)

آپ دیکھئے' کہ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر اوپر والے پانی نہیں دیتے تو نیچے والوں کو چاہئے کہ صبر شکر کر کے بیٹھ جائیں اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔ حضورؐ ایسا فرما ہی نہیں سکتے تھی کوئی ایسا شخص اس قسم کی بات نہیں کہے گا جسے معلوم ہو کہ جان کی حفاظت' ہر جاندار کی زندگی کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس تقاضا کو روکا نہیں جا سکتا۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ حقائق سے چشم پوشی کرتا ہے۔ اسی تقاضا کا اعتراف تھا جس کے لئے خدا نے بھوک سے مجبور و مضطر کے لئے حرام کھا لینے کی اجازت دی تھی۔ قرآن کریم کے اسی حقیقت بدوش فیصلہ کی تعمیل تھی جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والوں کو سزا نہیں دی تھی۔ اسی قرآنی فیصلہ کی عملی تشریح تھی جس کے لئے امام ابن حزم نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ بھوکے' پیاسے' ننگے کو ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے جنگ تک بھی کرنی پڑے تو اسے معذور سمجھا جائے گا۔۔۔ اور اسی صورت حال کو روکنے کے لئے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ کشتی اسی صورت میں سلامت رہ سکتی ہے جب تمام اہل کشتی کو ضرورت کے مطابق پانی ملتا رہے۔

یہ تھا خدا کا فیصلہ اور یہ تھی اس فیصلے کی عملی تشریح جو اس کے رسولؐ نے بیان فرمائی۔ لیکن اب یہ فیصلہ سمٹ سمٹا کر صرف اتنا رہ گیا کہ بھوکے کے لئے' اضطراری حالت میں سؤر کا گوشت کھانا جائز ہے۔۔۔ یعنی جس بھوکے کے پاس روٹی کھانے کے لئے چار آنے کے پیسے نہیں' وہ کہیں سے تلاش کر کے' دس روپے کا لحم خنزیز حاصل کرے تو اس سے اپنی بھوک مٹا سکتا ہے۔۔۔ آپ نے دیکھا کہ اس فتویٰ کی رو سے کس طرح قرآن کا حکم بھی (بظاہر) اپنے مقام پر باقی رہا اور ''کشتی'' کے اوپر کے حصے والے'' بھی دندناتے پھرتے رہے! لیکن اس قسم کی خود فریبی یا ابلہ فریبی سے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق' کشتی تو سلامت نہیں رہ سکتی۔

ظواہر پرستی:

دین کے نظام میں' نماز' روزہ' حج وغیرہ وہ ذرائع تھے جن سے دین کا مقصود حاصل ہونا

تھا۔ یعنی مساواتِ انسانیہ اور احترامِ آدمیت کا مقصدِ عظیم۔ لیکن مذہب میں یہی چیزیں مقصود بالذات بن گئیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب زور نماز‘ روزہ وغیرہ کی ظاہر اور رسمی ہیئت کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور اس مقصد کو سامنے لایا ہی نہیں جاتا جس کے حصول کا یہ ذریعہ تھے۔ اس کے برعکس‘ قرآن کو دیکھئے تو وہ سارا زور مقصد پر دیتا ہے۔ غور سے سنئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی کی راہ اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر‘ اس کے قانون مکافات عمل کے لئے حیات آخرت پر‘ ملائکہ پر‘ ضابطہ خداوندی پر اور ان انبیاء پر جن کی وساطت سے یہ ضوابط خداوندی دنیا کو ملے۔ ان امور پر ایمان لائے اور پھر مال کی محبت کے باوجود اسے ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے جو اس کے قرب وجوار میں (یا رشتہ داروں میں) محتاج ہوں۔ جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں۔ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو‘ یا ان میں کام کرنے کی استطاعت نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جن کے پاس زادِ راہ نہ رہے‘ یا وہ جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو۔ یا جو لوگ دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں۔ انہیں آزاد کرانے کے لئے اپنی فاضلہ دولت کو وقف کر دیں۔ نیکی کی راہ ان لوگوں کی ہے۔۔ الخ (2:177)

ایمان کی اہمیت:

اس مقام پر میں‘ ایک ثانیہ کے لئے رک کر‘ ایک اہم نکتہ کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس آیہ جلیلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اصل نیکی کا کام یہ ہے کہ تم دوسروں کی مدد کے لئے اپنا مال کھلا رکھو۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اہم شرط بھی عائد کر دی ہے اور وہ یہ کہ تم دین کے ان اساسی عناصر پر ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ ایمان کی کیا اہمیت ہے اور اس کے بغیر خود مال کا دینا بھی نیکی کا کام کیوں نہیں قرار پاتا۔ ایمان‘ درحقیقت وہ آئیڈیالوجی‘ وہ نظریہ‘ ہے جو زندگی کا صحیح تصور عطا‘ اور اس کا نصب العین متعین کرتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ہی ہے جس کی بنیادوں پر اعمال انسانی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہی‘ کسی کام کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار بنتی ہے۔ اسی کے مطابق انسانی اعمال اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ انسانی عمل کا جذبہ محرکہ ہی اس کا ایمان (آئیڈیالوجی) ہوتا ہے۔ اور یہی اس کے لئے صحیح اقدار حیات متعین کرتا ہے۔ اقدار (Values) نہ ہوں تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب زندگی کو

محض آب وگل کا کھیل سمجھا جائے اور موت کو اس کا انجام' تو انسانی زندگی' حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوتی۔ یہ صحیح آئیڈیالوجی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے اشتراکیت جیسا معاشی نظام' جو سرمایہ داری کے مقابلہ میں کہیں انسانیت ساز ثابت ہو سکتا تھا' پروان نہیں چڑھ رہا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن' ایمان (آئیڈیالوجی یا صحیح نظریہ حیات) کو اپنے معاشی نظام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو اقتدار یا نظام' نظریۂ حیات یا اقدار کے بجائے اشخاص سے وابستہ ہو' اس کی عمر' شخص متعلقہ کی عمر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نظریہ پر مبنی نظام' اشخاص کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب تک وہ اقدار قائم رہیں وہ نظام بھی قائم رہتا ہے۔ یہی وہ عظیم اصولی حقیقت تھی جس کی وضاحت کے لئے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ۔۔وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ (3:144) یعنی' اور تو اور' خود محمدؐ بھی بجز ایں نیست کہ اللہ کے ایک پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے پیغامبر آتے رہے اور اپنی عمر پوری کرنے کے بعد دنیا سے چلے جاتے رہے۔ تو کیا اگر کل کو یہ بھی قتل کر دیئے جائیں' یا وفات پا جائیں' تو تم یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام صرف ان کی ذات سے وابستہ تھا' پھر اپنے نظام کہن کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ اور اس کی تشریح خلیفہ رسول' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح فرمائی کہ جب رسولؐ اللہ کی وفات پر امت میں کہرام مچ گیا تو آپ نے حاضرین کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ اس بات کو غور سے سن لو کہ جس شخص نے محمدؐ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی وہ سمجھ لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے۔ لیکن جو خدا کا عبد تھا اسے اطمینان رکھنا چاہئے کہ اس کا معبود حیی وقیوم ہے۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اس اعلان عظیم نے دین کے نظام کو شخصیتوں سے بلند لیجا کر اقدار ونظریات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہ نظام اس وقت بگڑا جب مسلمانوں نے قرآنی نظریۂ زندگی کو چھوڑ کر غیر قرآنی نظریات وتصورات کو اختیار کر لیا' اور سارا زور شخصیتوں پر دینے لگ گئے یا شخصیتیں سارا زور اپنے آپ کو منوانے پر صرف کرنے لگ گئیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا ارفع واعلیٰ نظریہ پیش کیا تھا اور اس نظریہ کے مطابق حضور نبی اکرمؐ نے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی تھی جو رنگ' نسل' زبان' وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر' ایک عالمگیر وحدت بن گئی تھی۔ اس باب میں' میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر وحدت امت اس

صورت میں وجود پذیر ہوسکتی ہے جب اس آئیڈیالوجی کی نمود ہماری عملی زندگی میں ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور آئیڈیالوجی محض الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جائے جسے رسمی طور پر دہرالیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے وحدت امت کبھی ظہور میں نہیں آسکتی' ایسا کرنے والے افراد کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ آپ سوچئے کہ اس وقت دنیا میں ساٹھ ستر کروڑ مسلمان بستے ہیں جو زبانی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک' رسول ایک' قبلہ ایک' کلمہ ایک ہے۔ اس اقرار کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لاشعوری طور پر اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ سب مسلمان ۔۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخد کاشغر ۔۔ ایک قوم کے افراد ہیں۔ لیکن عملاً ہماری صورت یہ ہے کہ ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان تو ایک طرف' ایک ملک کے مسلمان باشندے بھی ایک قوم کے افراد نہیں۔ اس خودفریبی کا سخت مضرت رساں پہلو یہ ہے کہ' ہم آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک قوم تو بنتے نہیں' اور دنیا نے آئیڈیالوجی سے الگ ہٹ کر' تشکیل قومیت کے جو عناصر تجویز کئے ہیں' ۔۔ مثلاً نسل' یا وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل ۔۔ انہیں' نہ صرف یہ کہ ہم اپناتے نہیں بلکہ انہیں خلاف اسلام قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر' اسلام کو ہم اپنی عملی زندگی میں رائج نہیں کرتے اور کفر کو ہم اپناتے نہیں۔ یعنی ہم نہ آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک قوم بنتے ہیں (جو قرآن کا تقاضا تھا) اور نہ ہی باقی اقوام عالم کے معیاروں کے مطابق ایک قوم بنتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا میں مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں' انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قومی اور اجتماعی نہیں۔ اس کا مشاہدہ آپ خود پاکستان میں کر سکتے ہیں۔ ہم اب بھی قوم نہیں بن سکے' انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کے سامنے اپنا اپنا انفرادی مفاد ہے۔ اجتماعی مفاد کسی کے پیش نظر نہیں۔ یہ ہوتا ہے حشر اس قوم کا جو آئیڈیالوجی کے الفاظ کو دہرا کر اس فریب نفس میں مبتلا ہو جائے کہ یہ اپنے نتائج عملاً مرتب کر دے گی۔

☆☆☆☆

اب پھر اسی مقام کی طرف آیئے جہاں سے میں نے اس سلسلے کو چھوڑا تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ' قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ نیکی اور سعادت کی راہ' ارکان اسلامی کی رسمی پابندی نہیں۔ نیکی اور کشاد کی راہ اس کی ہے جو دین کے مقصود و منتہیٰ پر نگاہ رکھے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کے مختلف کام سرانجام دے دینے سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو خدا اور حیات آخرت پر ایمان رکھے اور خدا کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرے۔ (تم اپنے خودتراشیدہ تصور مذہب کی رو سے کچھ ہی سمجھ لو) میزان خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (جو ایسا سمجھتے ہیں وہ ظلم کرتے ہیں) اور خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ ظالمین پر فلاح وسعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی۔

یاد رکھو! جو لوگ خدا کے متعین کردہ نصب العین (آئیڈیالوجی) پر یقین محکم رکھتے ہیں اور نظام خداوندی کے قیام وبقا کے لئے اپنی جان ور مال سے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں اور اس بلند مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ چھوڑنا پڑے' اسے بلا تامل وتوقف چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے مدارج معیار خداوندی کے مطابق بہت بلند ہیں اور یہی لوگ درحقیقت کامیاب و فائز المرام ہیں (9:19-20)۔

مساوات کے نمونے:

یہی وہ نظام تھا جس میں' کوئی فرد معاشرہ تو ایک طرف' (حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق) اگر کوئی کتا بھی بھوک سے مر جاتا تو معاشرہ کا سربراہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا تھا۔ اور یہی تھا وہ نظام جس میں مملکت کا سربراہ اس وقت تک گیہوں کی روٹی نہیں کھاتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا مقصد مساوات انسانیہ تھا۔ آپ ہمارے واعظوں کو جھوم جھوم کر بیان کرتے دیکھیں گے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول ﷺ اللہ کا کوئی کپڑا کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا اور حضرت عمرؓ منبر پر کھڑے تھے تو دیکھا گیا کہ ان کے تہبند میں دس بارہ پیوند تھے وہ ان واقعات کو بیان کر کے تاثر یہ دیں گے کہ یہ ان حضرات کی ذاتی اور انفرادی خوبیاں تھیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ فطری نتیجہ تھا اس نظام کا جس کی بنیاد انسانی مساوات پر تھی۔ وہ نظام جس میں تمام افراد معاشرہ کا معیار زیست ایک جیسا تھا جس میں جو ایک کو میسر آتا تھا وہی سب کو مہیا ہوتا تھا۔

مساوات سے مقصود:

آگے بڑھنے سے پہلے' میں اس مساوات کی تھوڑی سی تشریح ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ

مساوات ایسی نہیں تھی جیسے جیل خانہ میں قیدیوں کو ایک جیسی وردی پہننے کو اور ایک جیسی روٹی کھانے کو ملتی ہے (ضمناً' اب تو جیل خانوں میں بھی یہ مساوات باقی نہیں رہی۔ ایک امیر آدمی' اور غریب آدمی' ایک ہی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور عدالت سے انہیں ایک ہی جیسی سزا ملتی ہے۔ لیکن جیل خانہ میں امیر آدمی کو اے کلاس دے دی جاتی ہے اور غریب آدمی کو سی کلاس۔ اور دیگر آسائشوں کے علاوہ' یہی سی کلاس قیدی' اس اے کلاس والے کو بطور خدمت گار عطا کر دیا جاتا ہے۔ یعنی دونوں ایک جیسے مجرم ہیں لیکن ان میں سے وہاں بھی ایک آقا ہے اور دوسرا اس کا غلام) بہر حال' میں کہہ یہ رہا تھا کہ مساوات انسانیہ سے مراد' جیل خانہ کی سی مساوات نہیں اس سے مراد ایسی مساوات ہے جو ایک شریف گھر کے افراد میں ہوتی ہے۔ اس میں' گھر کی آمدنی میں سے ہر ایک فرد خاندان کو اس کی ضروریات کے بقدر ملتا جاتا ہے۔ ان میں فرق ضروریات کا ہوتا ہے۔ معیار زندگی کا نہیں۔ یہی کیفیت قرآنی نظام میں افراد معاشرہ کی ہوتی ہے۔ اس میں' قوم کے سارے بچوں کو ابنائے ملت سمجھا جاتا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد' ہر ایک کی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کار کر دی جاتی ہے۔ ہر فرد اس کام کو نہایت محنت اور دیانت سے سرانجام دیتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے' اور نظام معاشرہ اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضروریات زندگی مہیا کئے چلا جاتا ہے۔ اس میں معیار زیست تو سب کا ایک ہوتا ہے' لیکن انفرادی ذوق ور پسند کا میدان وسیع ہوتا ہے۔۔ یعنی انسان اور انسان سب برابر (اس میں مرد اور عورت کی بھی کوئی تخصیص وتمیز نہیں) معاشرہ میں مدارج ہر ایک کے جوہر ذاتی' بلندی سیرت و کردار اور حسن کارکردگی کے مطابق۔ اور ضروریات زندگی کے مہیا کئے جانے میں انفرادی حسن ذوق کے مطابق انتخاب کی گنجائش۔ جوں جوں قومی دولت بڑھتی جائے' معاشرہ کا معیار زیست بلند ہوتا چلا جائے۔ یہ ہے نقشہ قرآنی نظام معاشرہ میں مساوات انسانیہ کا۔ یہی تھی وہ مساوات جس کے لئے اس نظام کے ارکان۔۔ صلوٰۃ' صیام' حج' زکوٰۃ وغیرہ۔۔ کا تعین کیا گیا تھا۔ ہمارا واعظ اب بھی مساوات کا ذکر کرتا ہے' اور بڑے فخر کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن اب اس مساوات کی صرف رسم باقی ہے۔ اس کی روح اور حقیقت غائب ہے۔ اب بھی ہماری مسجدوں میں ''محمود وایاز'' ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان میں یہ مساوات صرف مسجد کی صف تک محدود ہوتی ہے۔ مسجد سے باہر نکلتے ہی۔۔ بلکہ اس

صف سے اٹھنے کے بعد' صحن مسجد میں ہی ء۔۔ محمود' محمود ہوتا ہے اور ایاز' ایاز۔۔ عرفات کے میدان میں بھی بے شک امیر اور غریب سب ایک بن سلی چادر میں ملبوس کھڑے ہوتے ہیں لیکن وہاں سے لوٹنے کے بعد' امیر حاجی جس ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رات بسر کرتا ہے' غریب بیچارا اس کا تصور مرنے کے بعد کی جنت میں ہی کرسکتا ہے اس زندگی میں کبھی نہیں کرسکتا۔

ہمارا واعظ اب بھی بتاتا ہے کہ دیکھئے۔ روزہ میں غریب اور امیر ایک ہی طرح سارا دن بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔ یہ اسلامی مساوات ہے۔ لیکن وہ اس فرق کو کبھی سامنے نہیں لاتا جو ان دونوں کی سحری اور افطار میں ہوتا ہے۔ امیر کے بیٹے کی پہلی افطاری کے جشن میں جو کچھ ایک شام کو صرف ہوجاتا ہے وہ اس غریب کی سال بھر کی آمدنی سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

اجتماع عید کا منظر:

اس رسمی اور روایتی مساوات کا بھانڈا بال آخر' عیدگاہ میں جا کر پھوٹتا ہے۔ جس انداز سے عید کے چاند کا انتظار ہوتا ہے اور جس ذوق وشوق اور جوش وخروش سے اس کا استقبال کیا جاتا ہے' اس سے یوں نظر آتا ہے گویا ساری قوم ہمہ تن جشن مسرت ہے لیکن صبح جب عید کے اجتماع کے لئے جایئے' تو دور ہی سے یہ آوازیں فضا میں تھرتھری پیدا کرتے دکھائی دیتی ہیں کہ ''بابا! خدا کے نام پر۔۔ چار پیسے دیتے جایئے۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔'' ''میاں صاحب! اللہ کے واسطے میری جھولی میں کچھ ڈالتے جایئے۔ میں ایک لاوارث بیوہ ہوں جس کے بچوں کے تن پر سردی سے بچنے کے لئے کپڑا تک نہیں۔'' دوسری طرف سے یہ دلگداز اور جگر خراش صدا وجۂ سوہان روح بنتی ہے کہ ''بابا! میں تین مہینے سے بیمار اور لاچار ہوں۔ میری دوائی کے لئے کچھ دیتے جایئے۔ خدا تمہاری نماز' روزے قبول کرے گا۔'' یہ زہرہ گداز اور دل سوز آوازیں سنتے سنتے آپ عیدگاہ میں داخل ہوں' تو وہاں اس سے بھی زیادہ جگر پاش منظر دکھائی دے گا۔ فاقوں کے مارے ہوئے زرد زرد چہرے۔ افلاس وغربت کے جھنجھوڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے' افسردہ پیشانیاں' پژمردہ آنکھیں۔ پوری فضا پر عبرت انگیز مایوسیوں کی ہولناکی مسلط۔۔ اس سے پہلے' پھر بھی ایسا ہوتا تھا کہ ہر شخص کو بالعموم اور بچوں کو بالخصوص کم از کم سال میں ایک بار' عید کے موقعہ پر' نئے کپڑے ضرور مل جاتے تھی اب آپ عیدگاہ کے اجتماع پر نگاہ ڈالئے۔ شاید ایک فیصد نمازی بھی ایسے نظر نہ آئیں گے جو نئے کپڑوں میں ملبوس ہوں۔ باقی سب نے انہی پرانے کپڑوں کو دھو کر تن ڈھانپ رکھا ہوگا۔ اور ان میں بھی اکثر ایسے جنکے کپڑوں کے چیتھڑے اڑے

ہوئے ہوں۔۔ ادھر چندہ مانگنے والے صفوں میں جھولیاں لئے پھر رہے ہیں۔ ادھر امام صاحب صدقۂ فطر کے فضائل بیان فرما رہے ہیں۔۔ اس سے وہ سرمایہ داروں کو جنت کی بشارتیں دیتے ہیں اور غریبوں اور محتاجوں کو تقدیرِ خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین فرماتے ہیں اور اس طرح ان کی نگاہ کبھی اس باطل نظام کی طرف اٹھنے نہیں دیتے جس کی پیدا کردہ ناہمواریوں کا نام تقدیر خداوندی رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس قوم کا جشنِ عید' جسے جشن کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یاد رکھیئے! جس جشن میں قوم کا ایک فرد بھی حقیقی مسرت سے محروم رہ جائے' وہ جشن' جشن نہیں۔ قوم کی بدنصیبی کا ماتم ہے۔ عید اسی قوم کی ہے جسے رزق (حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ میں) خدا کے آسمانی نظام کی رو سے ملتا ہے اور جس میں ہر فرد معاشرہ' بلا منت غیرے' بطور استحقاق' برابر کا شریک ہوتا ہے۔ جس قوم کو انسانوں کے خود ساختہ نظام کے تابع رزق ملے۔۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ چند افراد تو قارون کے خزانے کے مالک ہوں اور باقی افراد معاشرہ روٹی کے ٹکڑے کے لئے بھی ترس رہے ہوں۔ اور اگر انہیں وہ ٹکڑہ ملے بھی تو شرف و تکریم انسانیت بیچ کر ملے۔۔ اس قوم کی عید' ایک مقدس فریب سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وہ عید ہے جس کا ہلال' اس قوم کی ہنسی اڑاتا ہے' اور دنیا کی قومیں جس کی فریب خوردگی کا تماشہ دیکھنے کے لئے دور دور سے آتی ہیں۔

دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ اسی (عید کی) نماز کے لئے امام نے بتایا تھا کہ اس میں چھ زائد تکبیریں ہوتی ہیں۔ تکبیر کے معنی ہیں۔۔ اللہ اکبر کا اعلان۔۔ مذہب میں چھ چھوڑ کر' چھ سو مرتبہ بھی اللہ اکبر کہیئے تو اس کا' دو لفظ دہرانے سے زیادہ نہ کوئی مفہوم ہوتا ہے' نہ کوئی نتیجہ۔ لیکن دین کے نظام میں اللہ اکبر کے اعلان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خدا کے قانون سے بالا کوئی قانون نہیں اور آسمانی نظام سے برتر کوئی نظام نہیں کائنات میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدائی نظام کو حاصل ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں اکبر و اصغر کی کوئی تفریق نہیں اس لئے کہ نہ کوئی کسی کا محتاج ہے نہ محکوم۔۔ سوچئے کہ اس تکبیر میں اور نماز عید کی موجودہ تکبیروں میں کس قدر فرق ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جشنِ عید شاہیں بچوں کا حق ہوتا ہے۔۔ مردار خور کرگسوں کا نہیں! والسلام